Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:6 (1966)

اسلامی سوشلزم

پروفیسر محمد عثمان

ہمارے ہاں اسلامک سوشلزم کی بحث گزشتہ چند ماہ میں جہاں جاذبِ توجہ بنی ہے، وہاں خاصی اُلجھ بھی گئی ہے۔ کچھ حضرات نے نہ صرف اس کی اسمی ترکیب کو قابلِ اعتراض اور خلافِ روحِ اسلام قرار دیا ہے بلکہ اس ترکیب یا تحریک کے پیچھے جو جذبہ اور فکر کام کرتا ہے، اس کی صحت و افادیت اور اسلامیت سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ایک دو صاحبوں نے تو جوشِ بیان میں اس کے لئے کچھ ایسے کلماتِ توصیف استعمال کئے ہیں جنہیں علمی لحاظ سے خلافِ آداب اور سیاسی زبان میں غیر پارلیمانی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ اس تحریک یا خیال کی حمایت و مدافعت میں سرگرم ہیں، وہ بسا اوقات ایسا طرزِ استدلال اختیار کرتے ہیں جو اِن کے موقف کو کمزور کر دیتا ہے یا پھر ان کو اسلامی سوشلزم کی بجائے محض سوشلزم یا کمیونزم کا حامی و علمبردار ثابت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب امور ایک سیدھی سادی بات کو پیچیدہ بنانے ہی کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

پہلے میں آپ سے وہ سیدھی سادی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔ آپ قرآنِ حکیم کو الحمد سے والناس تک پڑھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جن مسائل کو حضور باری تعالیٰ نے بار بار ذکر فرمایا ہے اور جن کے بارے میں جگہ جگہ ہماری رہنمائی فرمائی ہے ان میں ایک معاش کا مسئلہ بھی ہے۔ نزولِ وحی کے بالکل ابتدائی زمانے کی بہت سی سورتوں میں غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے اور یتیموں اور محتاجوں کی ضروریات کی دیکھ بھال کو بنیادی اور فیصلہ کن نیکی قرار دیا گیا ہے۔ ذرا آگے چل کر دولت مندوں اور ذی استطاعت لوگوں کو یہ بتایا اور سمجھایا گیا ہے کہ تمہارے مال و دولت میں غریبوں کا ایک واضح حصہ ہے اور یہ حصہ بطور حق کے ہے۔ پھر مسلمانوں کو صدقہ و خیرات کی جا بجا تلقین کی گئی ہے اور خدا کی راہ یعنی رفاہِ عامہ پر خرچ کئے بغیر نیکی کا حصول ناممکن قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ پر جو زور قرآنِ حکیم میں ہے وہ ہر مسلمان اور قرآن خواں پر روشن ہے۔ بیسیوں مقامات پر جہاں

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

صلوٰۃ کی تلقین وتاکید ہے اُس کے ساتھ ہی فریضۂ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہے۔ ان احکام کے ساتھ سود کی نہایت سختی سے ممانعت کی گئی ہے تاکہ روپے پیسے والے غریبوں کو لوٹنے کی نفسیات سے مبرا رہیں۔ ایک جگہ بِن لڑائی کئے ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت کو غربا میں تقسیم کرنے کا حکم ہے اور اس حکم کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ دولت صرف دولت مندوں کے درمیان ہی نہ رہ جائے۔

ان سب احکام وتلقین اور تاکید وتحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اجتماعی مفاد میں دولت خرچ کرنے اور غربا کی مدد پر ایسے آمادہ ومستعد ہوئے کہ استطاعت کے مطابق خرچ کرنے کے باوجود اُن کا ذوقِ اِنفاق مطمئن نہ ہوتا تھا اور وہ رسولِ کریمؐ سے دریافت کرتے تھے کہ مزید کیا اور کتنا خرچ کریں۔ اس پر یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی کہ اپنی ضروریات سے جو کچھ بچتا ہے، چاہو تو سب کا سب رفاہِ عامہ میں صرف کر ڈالو۔ ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔

ان احکام کی روشنی اور برکت سے جو معاشرہ تعمیر ہوا، وہ انسانی تاریخ کا ایک روشن ترین باب ہے اور اس کی جزئیات اور تفصیلات دوستوں اور دشمنوں پر ایسی عیاں ہیں کہ کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ مدینہ کے انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ محبت واشتراک کا یہ ثبوت دیا کہ نہ صرف کاروبار اور گھربار بانٹ لئے بلکہ بعض انصار نے جن کی زوجیت میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں اپنی کسی بیوی کو اس جذبے سے طلاق دے دی کہ اس کا مہاجر بھائی اپنا گھر بسا لے۔

رسول اکرم صلعم کے بعد حضرت ابو بکرؓ کی زندگی اور دَور میں اخلاص واشتراک کا یہ جذبہ برقرار رہا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اپنے روزمرہ خرچ کے لئے صرف اُسی قدر لینا گوارا کیا جو مملکت کے غریب سے غریب مسلمان کی اوسط کمائی کے برابر تھا۔ اور جب مسلمانوں ہی کے ایک گروہ نے زکوٰۃ کے اصول اور ادارہ سے انحراف کرنا چاہا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کے اس فعل کو جنگ وقتال سے زیادہ سنگین خیال کیا اور منکرینِ زکوٰۃ کو راہِ راست پر لائے بغیر دم نہ لیا۔

حضرت عمرؓ کی سادگی، ایثار، عوام سے ان کی محبت اور ان کی خبرگیری کے جذبے سے ہم سب واقف ہیں۔ امیر المومنین عمرؓ کی زندگی کے کتنے ہی واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کے دَور میں ہر مرد اور عورت، ہر بچے اور بوڑھے کی بنیادی ضروریات کی کفالت پر مملکت کی نگاہ تھی۔

ہم میں سے کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ رسول اکرم صلعم اور آپؐ کے فوراً بعد کا عہد اسلامی زندگی کا بہترین نمونہ ہے، لیکن افسوس کہ جہاں انفرادی زندگی کے لئے ہم نے اُس کی طرف بار بار پلٹ کر دیکھا

اور اس سے مقدور بھر روشنی اور رہنمائی حاصل کی، وہاں غالباً قومی شعور کی کمی کے باعث اس کے اجتماعی اور بالخصوص معاشی پہلو سے ہم نے کچھ سبق نہ سیکھا ورنہ ہماری معاشرتی زندگی کے بہت سے ناسور صدیوں نہ رِستے رہتے یا ان کا علاج کب کا ہو چکا ہوتا۔

غلط فہمی، لاعلمی یا تنگ نظری کی اور بات ہے ورنہ اگر آپ سوشلزم کی اصل اور اس کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہیں تو آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ سوشلزم کا بنیادی مفہوم سوسائٹی میں تقسیمِ دولت کی ناہمواری کو کم کر کے معاشرتی انصاف قائم کرنا ہے تاکہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تمام افراد کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اور کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا معاشرہ صحت مند اور مضبوط ہو۔

اپنے اس بیان کی صداقت کے کچھ ثبوت میں آئندہ سطروں میں پیش کروں گا۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ جہاں تک انسان کے معاشی مسئلے کا تعلق ہے آپ غور فرمائیں کہ اسلام کے مقاصد اور سوشلزم کے مقاصد میں کس قدر اتحاد اور یکسانگی ہے۔ رسول اکرمؐ اور حضورؐ کے فوراً بعد کے اسلامی معاشرے کو اگر جدید اصطلاحی زبان میں بیان کرنا ہو تو آپ اسے بلاخوفِ تردید ایک سوشلسٹ معاشرہ قرار دے سکتے ہیں۔ اور قرآنِ حکیم معاشی مسائل میں ہمیں جو مجموعی انسانی نقطۂ نظر بخشتا ہے وہ مروّجہ نظام ہائے معاش میں سب سے زیادہ سوشلزم کے قریب ہے۔

(۲)

ہمارے ہاں فکری الجھاؤ کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ واقفیت کی کمی کے باعث ہمارے عوام اور خواص کا ایک بڑا طبقہ کمیونزم اور سوشلزم کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ تاریخ کا جو مادی نظریہ، طبقاتی جنگ کا جو تجزیہ اور اس کے علاج کی جو صورتیں کمیونزم کا جزوِ لاینفک ہیں، سوشلزم کے اجزائے ترکیبی بھی وہی ہیں۔ لہٰذا وہ اسلام اور سوشلزم میں وہی مغائرت اور بُعد تصوّر کرتا ہے جو اُن کے ایمان کی رُو سے اسلام اور کمیونزم میں واقعتاً پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس زمانے میں اس سے بڑی اور افسوس ناک تر غلط فہمی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

آپ سوشلزم پر کسی بھی قابلِ ذکر مصنف کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھئے یا برطانیہ یا امریکہ کے تیار کردہ انسائیکلوپیڈیا سے رجوع کیجئے تو آپ کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ سوشلزم اور کمیونزم دو مختلف بلکہ بعض اعتبار سے دو متضاد تحریکیں ہیں اور جہاں تک کمیونزم کے تاریخی، طبقاتی اور انقلابی افکار کا تعلق ہے اکثر سوشلسٹ جماعتیں درحقیقت ان کی ضد اور ان کی تردید پر قائم ہیں۔ بے شمار پہلوؤں سے سوشلسٹ تحریک "اینٹی کمیونسٹ"

تحریک ہے۔ کیمونزم کا رد ہے، اس کا جواب ہے۔ اس کے سیلاب اور اگر آپ یہ لفظ پسند کریں تو اس کی تباہ کاری کو روکنے کے لئے اعتدال، میانہ روی اور تدریج کا ایک مضبوط بندھ ہے مگر یار لوگ جن میں خواندہ و نیم خواندہ، عالم و جاہل، سخت مذہب پسند اور شدید دنیادار سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ اسے کیمونزم ہی سمجھے جا رہے ہیں۔

اپنے بیان کے ثبوت کے لئے میں انگلستان کی لیبر پارٹی اور مصر کی عرب سوشلسٹ یونین کا ذکر کروں گا، غالباً ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ انگلستان میں یہ پارٹی معرضِ وجود میں آئی۔ اس کی پیشرو دو جماعتوں کے نام برٹش سوشلسٹ پارٹی اور انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی تھے۔ لیبر جماعت ایک باقاعدہ سوشلسٹ جماعت ہے اور سوشلزم پر اس کے رہنماؤں نے بے شمار رسالے اور کتابیں شائع کر رکھی ہیں۔ یہ جماعت اعتدال اور تدریج کے ساتھ انگلستان کے معاشی مسائل کو سوشلسٹ طریقے پر حل کرنے کی علمبردار ہے لیکن اس کے ارکان اور رہنما الّا ماشاء اللہ سب کے سب عیسائی ہیں۔ وہ نہ تاریخ کے مادّی اور جدلیاتی تصور پر ایمان رکھتے ہیں نہ وہ طبقاتی جنگ کے اُس تجزیہ کو درست تسلیم کرتے ہیں جسے کارل مارکس نے پیش کیا ہے اور نہ وہ انقلابی اور غیر آئینی حربوں سے کام لیتے ہیں جو بالعموم کیمونزم سے منسوب ہیں اور جنہیں اکثر کیمونسٹ اپنی زبان اور عمل سے بلا تامل اپنا لیتے ہیں۔ لیبر جماعت آئینی طریقوں سے، قانون سازی کے ذریعے، جمہوری اداروں کا پورا احترام کرتے ہوئے، رائے عامہ کی تربیت کر کے اور امن و آشتی کی فضا بحال رکھ کر انگلستان کے معاشی نظام کو عوام کے حق میں مسلسل بدل رہی ہے اور گزشتہ بیس پچیس برس میں اس کی کامیاب آئینی کوششوں کو مبصرین نے ایک عظیم خاموش انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔ انگلستان کی لیبر پارٹی ان کے اپنے دعوے اور لٹریچر کی رُو سے پوری طرح ایک سوشلسٹ پارٹی ہے مگر وہ مذہبی اصولوں، اخلاقی قدروں اور باری تعالیٰ کے وجود سے منکر نہیں بلکہ اس میں ایک بھاری تعداد شدید مذہبی رجحان رکھنے والے انگریزوں کی ہے۔

اب آپ متحدہ عرب جمہوریہ کو دیکھئے۔ اس کے آئین کی دفعہ ۵ کی رُو سے مملکت کا مذہب اسلام ہے اور دفعہ ۲ کا ترجمہ یوں ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ ایک اشتراکی ریاست ہے جو مزدوروں، کسانوں، دانشوروں اور سپاہیوں کے اتحاد پر قائم و مبنی ہے۔ چنانچہ صدر ناصر کی سیاسی جماعت کا سرکاری نام عرب سوشلسٹ یونین ہے۔ اب اس بات سے تو کسی کو انکار نہ ہوگا کہ صدر ناصر اور ان کی کابینہ کے ارکان اور ان کی عرب سوشلسٹ یونین کے لاکھوں کارکن اور قائدین (سوائے معدودے چند مصری عیسائیوں کے) سب کے سب مسلمان ہیں اور ان کو اپنی مسلمانی اتنی ہی عزیز ہے اور اس کے بارے میں وہ اتنے ہی جذباتی

ہیں جتنے کہ ہم پاکستانی مسلمان۔ جذباتی سے یہاں میری مراد یہ ہے کہ اگر آپ ان کی مسلمانی میں شک کا اظہار کریں گے تو ان کا ردِ عمل انتہائی ناخوشگوار پائیں گے۔

عالمِ اسلام کا ذکر چھڑ گیا ہے تو یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ عراق میں مرحوم صدر عارف کی جماعت اور الجزائر میں ماخوذ صدر بن اللہ کی جماعت اور ان دونوں ملکوں میں جو حکومتیں اب برسرِ اقتدار ہیں، وہ بھی اپنے ہاں سوشلسٹ ریاستیں تعمیر کرنے کے منصوبے اور منشور کی پابند اور علمبردار ہیں اور ان کی مسلمانی کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ہمارے لئے کوئی محفوظ طرزِ عمل نہیں ہو سکتا۔

پھر آپ سوشلسٹ انٹرنیشنل کا وہ اعلان پڑھیئے جو ۱۹۵۱ء میں فرینکفورٹ (جرمنی) کے مقام پر منعقدہ ۲۲ ملکوں کی سوشلسٹ جماعتوں کی نمائندہ کانفرنس کے بعد جاری کیا گیا تھا۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جدید سوشلزم (جسے اصطلاحاً جمہوری سوشلزم کہنا چاہیئے) جہاں سرمایہ دارانہ نظام سے بہت مختلف ہے اور دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کی سخت مخالف ہے، وہاں وہ جمہوریت پر اپنے غیر متزلزل ایمان کے باعث ہر قسم کی آمریت کے، جس میں مزدوروں کے نام پر قائم ہونے والی کمیونسٹ آمریت بھی شامل ہے، شدید مخالف ہے۔ اس ضمن میں مذکرہ بالا سوشلسٹ انٹرنیشنل کے منشور کا مندرجہ ذیل پیرا دیکھ لینا کافی ہوگا۔

"کمیونزم کا سوشلسٹ روایت میں حصہ دار ہونے کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اُس نے درحقیقت اس روایت کو ناقابلِ شناخت حد تک مسخ کر دیا ہے۔ اور ایک ایسا متشددانہ نظریۂ حیات پیدا کیا ہے جو مارکسزم کی ناقدانہ روح کے منافی ہے۔ جہاں سوشلسٹوں کا مقصود اُس استحصال کو ختم کرنا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں انسانوں کو گروہوں میں بانٹتا ہے، وہاں کمیونسٹ ایک پارٹی کی آمریت قائم کرنے کی خاطر اس طبقاتی امتیاز کو اور گہرا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اپنی اس تمام گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں کہوں گا کہ جو لوگ آسانی کی خاطر یا لاعلمی کی بنا پر سوشلزم کو کمیونزم کے مترادف جانتے ہیں، شدید غلطی کے مرتکب ہیں، سوشلزم اپنے وسیع ترین معنوں میں صرف معاشی انصاف کی ایک تحریک ہے جسے کوئی بھی ملک یا کسی بھی اخلاقی یا مذہبی نظام کی حامل قوم اپنا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے بعض ملکوں میں کرسچن سوشلسٹ جماعتیں بھی ہیں۔ لیکن بیشتر ڈیموکریٹک سوشلسٹ یا سوشل ڈیموکریٹ جماعتیں ہیں جو سوشلزم اور جمہوریت کو لازم و ملزوم خیال کرتی ہیں اور قانونی اور پُرامن ذرائع سے اپنے اپنے ملکوں میں معاشی انصاف کی راہ

دی انسائیکلوپیڈیا امریکانہ۔ جلد پچیسویں، صفحہ ۱۹۵۰ (THE ENCYCLOPEDIA AMERICANA)

ہموار کرنے میں مصروف و سرگرم ہیں۔ اس طرح عرب ملکوں میں جو سوشلزم مقبول و رائج ہو رہا ہے اُسے کبھی عرب سوشلزم اور کبھی اسلامی سوشلزم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جن دو کتابوں کا چرچا عرب ملکوں کی سرحدوں سے نکل کر یورپ اور امریکہ تک پہنچا ہے، اُس میں پہلی کتاب مصر کے خالد محمد خالد کی ہے جس کا انگریزی ترجمہ FROM HERE WE START کے نام سے امریکہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مصر کے مخصوص مذہبی اور ثقافتی روایات کے پسِ منظر میں سوشلزم کو تعمیرِ نو کے ایک مؤثر لائحہ عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور دوسری کتاب شام کے نامور ڈاکٹر مصطفٰے السباعی کی "اشتراکیت الاسلام" ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے اسلامی اشتراکیت کو بڑے مدلّل اور دل نشیں اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اور اسلام کے معاشی نقطۂ نظر کی وہ خصوصیات نہایت تفصیل سے بیان کی ہیں جو اُسے ایک طرف کمیونزم سے اور دوسری طرف مغربی سرمایہ داری سے متمیز و ممتاز کرتی ہے۔

(۳)

اب اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھیئے۔ سرسید، اکبرؔ اور حالیؔ کے زمانے میں جدید نوع کا معاشی شعور نہ صرف ہم میں نہ اُبھرا تھا بلکہ برِصغیر کی دوسری قومیں بھی اس لحاظ سے کچھ بہتر نہ تھیں۔ ایشیا بھر میں یہ شعور اس صدی کے شروع میں یا زیادہ درست طور پر یوں کہیئے کہ روسی انقلاب (۱۹۱۷ء) کے بعد عام ہوا۔ ہندوؤں میں اس آگاہی کا پہلا نامور نمائندہ پنڈت جواہر لعل نہرو کو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ علّامہ اقبال کو یہ شعور اور اس کی گہرائی پنڈت نہرو سے کہیں پہلے نصیب ہوئی تھی۔ اس کا ثبوت تلاش کرنا ہو تو ۱۹۰۲ء میں ان کی شائع ہونے والی کتاب "علم الاقتصاد" سے لے کر ان کی وفات سے چند برس پہلے چھپنے والی مثنوی "پس چہ باید" کے علاوہ ان کی متعدد اُردو اور فارسی نظموں کو دیکھیئے جن کا تعلق معاشی مسائل سے ہے۔ لیکن ہمارے موضوع کے نقطۂ نظر سے ان کے وہ خطوط جو انہوں نے قائدِ اعظم کے نام مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۳۷ء تک لکھے، خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی تشویش ان کو مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی مستقبل کی طرف سے تھی، اُسی قدر وہ ان کی معاشی پس ماندگی کے باعث فکرمند تھے۔ ۲۱ر جون ۳۷ء کے خط میں ۱۹۳۵ء کے آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مزید برآں یہ دستور تو اس معاشی تنگ دستی کا جو شدید تر ہوتی جا رہی ہے کوئی علاج ہی نہیں۔"

اور پھر نہایت عمدگی سے فرماتے ہیں:۔

"فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پس ماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو اور نہ کر سکے، اُس کے لئے بے سود ہے۔"

اور ایک دوسرے خط میں برصغیر کے معاشی مسائل کا تبفصیل جائزہ لینے کے بعد اپنی سوچی سمجھی رائے کا یوں اظہار کرتے ہیں :

"اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا جب اُسے شریعت کی تائید حاصل ہو، حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا"

اس اقتباس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جو مردِ حق آگاہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۸ء میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک برصغیر کے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کا علمبردار تھا، اس کی بصیرت میں ہمارے معاشی مسائل کا حل اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کی ایسی موزوں صورت ہے جسے شریعتِ اسلامیہ کی تائید و موافقت حاصل ہو، جیسا میں نے عرض کیا شعور آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے جس چیز کو ۱۹۳۷ء میں "اشتراکی جمہوریت کی موزوں صورت" سے تعبیر کیا بعد میں قائداعظم اور بالخصوص مرحوم لیاقت علی خان نے اُسے باقاعدہ اسلامک سوشلزم (ISLAMIC SOCIALISM) کا نام دیا۔ طوالت کے خوف سے میں اپنی خواہش کے باوجود یہاں قائداعظم اور مرحوم لیاقت علی خان کی تقریروں کے وہ حصے درج نہیں کرتا جو مروجہ سرمایہ داری کی شدید مذمت میں اور اسلام کے اندر جو اشتراکیت پائی جاتی ہے، اُس کی حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ ایسا کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خود صدر ایوب نے ہمارے تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کے مطبوعہ خاکے کے پیش لفظ میں اسلامی سوشلزم کو اپنی معاشی منزل قرار دے کر اور اس کی نہایت عمدہ اور درست وضاحت کر کے، میرے نزدیک اس سوال پر ایسا واشگاف اور حتمی بیان دے دیا ہے کہ اس کے بعد قومی سطح پر کسی معقول اختلاف اور علمی نزاع کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ صدر ایوب متذکرہ پیش لفظ میں فرماتے ہیں :

"معاشی اور سماجی میدانوں میں ہماری تمام کوششوں کا منتہائے مقصود پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے حصول کی طرف تیزی سے آگے بڑھنا ہی ہو سکتا ہے۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح تقریباً "رفاہی ریاست" کا بدل ہے۔ البتہ معروف رفاہی مقاصد کے علاوہ اسلامی سوشلزم کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ معاشی ترقی کی بے محابا دوڑ میں ملک کے ثقافتی اور مذہبی ورثے کو برباد نہ ہونے دیا جائے بلکہ اُسے قائم و برقرار رکھا جائے۔ لہٰذا یہ تصور "رفاہی ریاست" سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

"اسلامی سوشلزم کے قیام کی اساس دولت کی مساوی تقسیم پر نہیں بلکہ سب کے لئے مساوی

مواقع کی فراہمی پر ہے۔ درحقیقت آمدنیوں میں مکمل مساوات تو کہیں بھی حتیٰ کہ کمیونسٹ ملکوں میں بھی حاصل نہیں ہوئی ہے کیوں کہ اگر افراد برابر کے مواقع سے آغاز کریں جب بھی مزاج اور استعدادوں کے اختلاف کے باعث آمدنیوں کا فرق ناگزیر ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ جو بات ضروری ہے یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی فطری صلاحیتوں کو ترقی دینے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیئے اور کوئی غیر منصفانہ معاشی یا سماجی نظام اس کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔

"لہذا ہماری قطعی پالیسی ہوگی کہ آمدنی اور دولت کو چند ہاتھوں میں غیر معمولی طور پر اکٹھا ہونے سے روکیں اور معاشی مواقع کو وسیع پیمانے پر تقسیم کریں اور نجی کاروبار کو اس طرح ضابطے میں لائیں کہ تمام معاشرے کو اس سے فائدہ پہنچے۔"

اگر کوئی سوال کرنے والا مجھ سے پوچھے کہ اسلامی سوشلزم کیا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جواب میں میں صدر ایوب کے ان الفاظ سے نہ ایک لفظ کم کہنا چاہوں گا اور نہ ایک لفظ زیادہ۔ میرے نقطۂ نظر سے جس اسلامی سوشلزم کی پاکستان میں اس مرحلہ پر ضرورت ہے اس کو بہت عمدہ، نہایت واضح اور کمال درستی کے ساتھ صدر ایوب کے متذکرہ پیش لفظ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ قوم میں اس احساس کو سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے بیدار کیا جائے جس کی توانا بیداری کے بغیر یہ ذمہ داری (یعنی اسلامی سوشلزم کے نصب العین کی طرف سے ہم پر عائد ہونے والی ذمہ داری) کما حقہٗ پوری نہیں ہو سکتی۔

(۴)

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ کیا "اسلامی سوشلزم" کی ترکیب روحِ اسلام کے خلاف ہے۔ اوّل تو آپ اسی بات پر غور فرمائیے کہ ہمارے بہترین دماغ اور ہمارے نہایت مخلص اور بیدار مغز قائدین جو اس وقت عالمِ اسلام میں موجود ہیں یا جو ابھی ابھی ہم سے رخصت ہوئے ہیں، انہوں نے پورے یقین و اعتماد اور کمال بصیرت کے ساتھ اس خیال اور ترکیب کو اختیار کیا ہے۔ اس فہرست میں علامہ اقبال، قائدِ اعظم محمد علی جناح، مرحوم لیاقت علی خان، صدر ایوب، صدر ناصر، عراق کے مرحوم صدر عارف، الجزائر کے سابق صدر بن اللہ کے اسماء خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے مصر، شام، لبنان، عراق، انڈونیشیا اور بھارت کے بیسیوں اہلِ نظر مسلمان اس تحریک اور ترکیب کے حامی اور علم بردار ہیں۔ ہمارے ہاں کے

علماء اور اربابِ فکر میں مولانا عبید اللہ سندھی، چوہدری افضل حق مرحوم، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور مولانا حسرت موہانی کی تحریریں اس نقطۂ نظر سے توجہ اور التفات کے قابل ہیں۔

یہاں میں ایک دلیل اور دینا چاہتا ہوں:۔

اسلامی تاریخ کے چودہ سو سال اس بات کے شاہد ہیں اور ہر زندہ اور دیرپا تحریک کے لئے یہ طرزِ عمل ناگزیر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ نسلِ انسانی کے احوال میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اور جس قسم کا شعور کسی عہد میں بطورِ خاص اُبھرتا ہے اور جس قسم کے ذہنی اور معاشرتی تقاضے کسی دور میں بنیادی اہمیت اختیار کرتے ہیں۔ بقا کی آرزو مند تحریک ان کا خصوصی نوٹس لے اور اپنی تعلیمات کے اُس پہلو کو نمایاں طور پر سامنے لائے جو اُس دور کے تقاضے اور شعور کو مطمئن کر سکتا ہو۔ اگر کوئی مذہب یا تحریک ایسا کرنے میں ناکام رہے اور اپنی تعلیمات کے پیش کرنے میں عہد شناسی اور دور بینی کا ثبوت نہ دے تو وہ مذہب یا تحریک آئینِ فطرت کے مطابق اپنی موت مر جاتی ہے۔ اسلام اس لئے ایک زندہ اور جاوداں مذہب ہے کہ وہ اپنی تعلیمات کی ہمہ گیری کی بدولت ہر عہد کی ضرورت اور ذوق کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا اور اپنی اس صلاحیت کی وجہ سے وہ فرسودہ (OUT OF DATE) نہیں ہوتا۔

ہم سب اس سے واقف ہیں کہ اٹھارویں اور بالخصوص انیسویں صدی میں جب انسانی شعور جمہوری قدروں اور اداروں کا گرویدہ اور پرستار ہوا تو مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے صدیوں تک بادشاہت کا دور دیکھنے کے باوجود یہ دعویٰ کیا کہ اسلام کا سیاسی نظام آمریت یا بادشاہت کی نسبت جمہوریت کے زیادہ قریب ہے اور یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے "شوریٰ" کا جو اصولِ کار ہمیں دیا ہے اور خلافتِ راشدہ کا جو طریقِ کار تھا، اس میں جمہوریت کی روح کام کرتی تھی۔ لہٰذا باوجود اس کے کہ ووٹ ڈالنے کا طریقہ، پارلیمنٹ بنانے کا ڈھنگ اور پارلیمانی حکومت کے بے شمار دوسرے پہلو قرآن حکیم میں بیان نہیں ہوئے، نہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں وہ معرضِ علم و عمل میں آئے، تاہم جمہوریت کی روح اور اصل چونکہ اسلام میں موجود تھی، اس لئے اس پر زور دینے میں ہم حق بجانب تھے کہ اسلام کا سیاسی نظام جمہوری ہے۔

اسی طرح اگرچہ ہم صدیوں تک جاگیرداری کا شکار رہے ہیں اور کچھ عرصہ سے بعض اسلامی ملکوں میں سرمایہ داری بھی جڑ پکڑ رہی ہے تاہم جب بالآخر نسلِ انسانی کا معاشی شعور جاگ اُٹھا ہے اور ہر طرف معاشی استحصال اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے اور مشرق و مغرب میں کروڑوں انسان دن

رات معاشی انصاف اور معاشری عدل قائم کرنے کی جد وجہد میں مصروف ہیں اور یہ دُھن لوگوں کی سب سے بڑی دُھن، اور یہ شعور نسلِ انسانی کا سب سے گہرا شعور اور یہ تقاضا نوعِ بشر کا سب سے حساس تقاضا بن گیا ہے، ہم اس پیشِ منظر میں جب قرآن حکیم پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور رسولِ اکرم صلعم کا عہدِ مبارک اور خلافتِ راشدہ کا مقدس دَور نگاہوں میں لاتے ہیں تو ہماری خوشگوار حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی جب ہم پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہ تعلیم اور یہ دَور جسے ہم بے شمار اور پہلوؤں سے مثالی جانتے تھے، معاشی انصاف اور مالی وسائل کی منصفانہ تقسیم کے اعتبار سے اور بھی مثالی اور حیات آفریں ہے۔ اور لامحالہ ہمارے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اس دَور میں ہم اسلامی تعلیمات کے اس پہلو پر خصوصی زور کیوں نہ دیں، اسلام کے معاشی نقطۂ نظر کو نمایاں کیوں نہ کریں، اور اگر سو پچاس سال پہلے اسلام کو جمہوریت کہنا یا اسلام میں موجود جمہوریت پر زور دینا اسلام کی بہترین خدمت اور سچائی کا موزوں ترین اظہار تھا تو آج اسلام کی اشتراکیت یعنی اسلامی اشتراکیت پر زور دینا کیوں کر اسلام کی بہترین خدمت اور سچائی کا بہترین اظہار نہیں ہو گا۔ آئینِ بقا کا تقاضا ہے کہ یوں کیا جائے۔ جو لوگ "اسلامی جمہوریت" یا "اسلامی اشتراکیت" جیسی ترکیبوں پر اعتراض کرتے ہیں وہ چھلکوں پر نگاہ جمانے والے اور مغز سے صرفِ نظر کرنے والے ہیں۔

★★★